آفتابِ علم وفضل غروب ہوگیا

جناب محمد نظر علی خاں رامپوری، سفارت خانہ کویت، نئی دہلی

۵ر نومبر ۱۹۸۳ء شنبہ کے روز ساڑھے بارہ بجے دن بذریعہ ٹیلیفون عزیزم سید نجم السلام میاں کی زبانی اِس خبرِ وحشت اثر سے کہ استاذی علامہ سید عبد الدائم الجلالی مفسرِ قرآنِ کریم داغِ مفارقت دے گئے، قلب ودماغ کو سخت صدمہ پہنچا۔

مولانا سید عبد الدائم صاحب جلالی مرحوم ۱۹۰۱ء میں رام پور میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی، اور رام پور ہی کی قدیم وعظیم علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ میں تقریباً ۲۵ سال مدرس وپرنسپل رہے۔

مصطفیٰ آباد عرف رامپور، پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی، لیکن علم وفضل کے اعتبار سے ایک قدآور شہر تھا، اور ایک زمانے میں بخارائے ہند کے نام سے مشہور تھا، یہ عظیم خطہ علماء وشعراء، اطباء وصوفیاء اور عظیم سیاسی لیڈروں کا مولد ومسکن رہا ہے۔

علامۂ عصر محقق زمانہ مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی فرزند مولانا نظام الدین سہالوی مؤسس درسِ نظامی، رامپور کی شہرۂ آفاق درسگاہ مدرسہ عالیہ کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ اور مشہور منطقی وفلسفی ملا محمد حسن جن کی شہرۂ آفاق منطق کی کتاب "ملا حسن" جو ہند وپاک کی ہر بڑی عربی درسگاہ میں داخلِ نصاب ہے، مدرسہ عالیہ رام پور میں مدرس رہے اور

رامپور ہی میں پیوندِ خاک ہوئے۔

اولیار اللہ میں مقتدائے مشائخ حضرت سید عبداللہ شاہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، اور مشہور بزرگ حافظ شاہ جمال اللہ علیہ الرحمۃ نے بھی رام پور ہی کو اپنا مسکن بنایا اور ہر دو بزرگوں کی آخری آرام گاہ بھی رامپور ہی ہے۔ اول الذکر بزرگ کے بغداد سے دہلی پہنچنے پر مشہور نقشبندی و مجددی بزرگ حضرت میاں مظہر جانجاناں اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجدد حضرت مولانا فخر الدینؒ نے موصوف کی پالکی کو کاندھا دیا تھا۔

شیخ شیوخ العالم امام الصوفیار شاہ احمد سعید مجددی کا وطن بھی رامپور ہی ہے، جن کے مریدین و خلفار میں عرب و عجم کے نامور علمار و مشائخ شامل تھے۔

امام منطق و فلسفہ، مجاہدِ آزادیِ ہند علامہ فضلِ حق خیر آبادی، اور اُن کے صاحبزادے بوعلی سینائے وقت، علمار منطق و فلسفہ کے استاذِ اعظم علامہ عبدالحق خیر آبادی، جن کی وفات پر جامعہ ازہر مصر میں کئی روز کی تعطیل کردی گئی تھی، اور جن کی کتابیں ان کی حیات ہی میں داخلِ نصاب ہند و مصر ہوگئی تھیں، اسی مدرسہ عالیہ رامپور میں مدتِ مدید تک پرنسپل رہے۔

اور اسی بخارائے ہند کی خاکِ پاک سے عظیم محدث میاں محمد شاہ صاحب استاذ مولانا ابوالکلام آزاد و علامہ شبلی نعمانی، اور میاں صاحب کے والدِ بزرگوار سید حسن شاہ صاحب محدث پیدا ہوئے۔

بوعلی سینائے ہند حکیم اعظم خاں رامپوری کی عظیم طبی تصانیف، اور مشہور مؤرخ مولوی نجم الغنی خاں صاحب کی عظیم علمی تصانیف کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آخر الذکر سے دوران گفتگو مصورِ فطرت شمس العلمار خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا کہ مولانا میری مصنفات کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے، (اس وقت غالباً خواجہ صاحب کی مصنفات کی تعداد ڈیڑھ سو ہی ہوگی) لیکن آپ کی ایک ہی کتاب میری تمام کتابوں سے زیادہ ضخیم ہے۔

مؤرخ اعظم علامہ شبلی نعمانی اور موجودہ صدی کے ہندو پاک کے سب سے بڑے عربی زبان و ادب کے ماہر علامہ عبدالعزیز میمن نے بھی اسی مدینۃ العلوم رامپور کے مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور یہیں مشہور عالم مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے علامہ عبدالعلی ریاضی داں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔

طبقۂ شعراء میں مشہور شاعر قائم چاند پوری اور بقول مولانا عرشی مرحوم ثم رامپوری کا مسکن و مدفن بھی رام پور ہی ہے۔

جگت استاد داغ دہلوی اور عظیم شاعر امیر مینائی کے مدت تک یہاں رہنے کی وجہ سے رامپور کو شاعری کے ایک تیسرے دبستان ہونے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ نظام رامپوری کی حسین غزلوں اور شیخ علی بخش بیمار رامپوری کی شاعری کو اردو زبان فراموش نہیں کر سکتی۔

اور غالب کا تذکرہ رامپور سے تعلق کے بغیر نامکمل ہے۔

اور اس آخری دورِ انحطاط و زوال میں بھی مولانا محمد علی جیسا عظیم سیاست داں اور مردِ مجاہد جس کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، اور عظیم و مشہور عالم و ادیب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی مرحوم بھی رامپور ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں علمی میدان میں چلنا اور دوڑنا سیکھا۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ذکر تھا مولانا سید عبدالدائم الجلالی کا۔ مولانا جلالی مرحوم و مغفور عصرِ حاضر کے بلند پایہ عالم، بلکہ جامع العلوم تھے، تفسیر و حدیث، فقہ و ادب، منطق و فلسفہ اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے، مطالعہ وسیع تھا، علوم متداولہ مستحضر تھے، وہ خطابت و تحریر دونوں میدانوں کے شہ سوار تھے۔

مولانا اعلیٰ درجے کے کامیاب مدرس تھے، منطق ہو یا فلسفہ، ادب ہو یا تفسیر، یعنی علومِ عقلیہ و نقلیہ جدید و قدیم دونوں کی کتابوں کے پڑھانے کی صلاحیت و استعدادِ تام

رکھتے تھے، کسی بھی مضمون کی کتاب جو اُن کے سپرد کی جاتی تھی، بہت عمدہ طریقے سے نہایت روانی کے ساتھ پڑھاتے تھے جس سے کہ طالب علم کمل طور پر مطمئن ہوجاتا تھا۔ میں نے مرحوم سے عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھی ہیں، مقاماتِ حریری جو عربی ادب کی نہایت مشکل کتاب ہے، اور جس میں مغلق و دقیق الفاظ و عبارات بکثرت ہیں، بغیر مطالعے اور بغیر غور و فکر و تامل کے پڑھایا کرتے تھے، اور ترجمہ اس قدر عمدہ کرتے تھے کہ اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں تھا، عموماً ایک عربی لفظ کے معنی ایک ہی اردو لفظ میں بیان کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عربی لفظ کا مقابل کوئی دوسرا اردو مترادف اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا ایسا نہیں تھا کہ ایک لفظ کی تشریح دس دس الفاظ میں کریں تب کہیں طالب علم مفہوم سمجھے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ عربی الفاظ کے زیادہ معانی نہیں جانتے تھے، وہ حافظ لغت تھے، جس طرح عربی زبان اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے، ایک ایک عربی لفظ کے دس دس، بیس بیس، پچاس پچاس معانی ہیں، اسی طرح مولانا بھی ایک ایک عربی لفظ کے دسیوں معانی جانتے تھے۔

تفسیرِ قرآن پر عبور و بصیرت کے سلسلے میں مولانا کے دو واقعے بیان کروں گا، اور وسعتِ معلوماتِ تصوف کے متعلق بھی دو واقعے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

تقریباً ۱۸ سال قبل مسجد درگاہ حضرت شاہ ابوالخیرؒ میں تراویح میں ختم قرآن کی مجلس تھی، حضرت مولانا زید ابوالحسن داعی تھے اور مولانا مدعو، کوئی بڑا اجتماع نہیں تھا، البتہ حاضرین پڑھے لکھے تھے۔ مولانا جلالی مرحوم نے قرآنِ کریم کے نزول و سبب نزول پر نہایت جامع اور بصیرت افروز تقریر کی، کیا عرض کروں اس تقریر کے متعلق، معلوم ہوتا تھا کہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، حضرت مولانا زید جو خود ایک متبحر عالم اور صاحب نسبت بزرگ ہیں، جھوم رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ کیا تبحرِ علمی ہے، افسوس کہ ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا کہ تقریر ٹیپ کرلی جاتی۔

دوسرے واقعے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا جلالی مرحوم نے قیامِ دہلی کے دوران مسجد گلی قاسم جان دہلی میں دو مرتبہ قرآنِ عظیم ترجمہ وتفسیر میں ختم کیا۔

مولانا نہایت پابندی کے ساتھ روزانہ اپنے مکان واقع گلی مدرسہ والی نزد جامع مسجد سے گلی قاسم جان قبل از نمازِ فجر جایا کرتے تھے، حالانکہ یہ پابندی مولانا کی افتادِ طبع کے خلاف تھی، غالباً کبھی انھوں نے ایسی پابندی نہیں کی ہوگی۔

مسجدِ مذکور میں ترجمہ وتفسیر کی ابتدار کا واقعہ بھی کافی دلچسپ ہے، دہلی کے ایک لائق ومشہور عالم اِس مسجد میں مدتِ دراز سے ترجمۂ کلام اللہ کیا کرتے تھے، ختم کے روز مولانا جلالی کو اختتامی تقریر اور دعار کے لئے دعوت دی گئی، مولانا نے اپنی تقریر میں سورۂ اخلاص کے معانی ومطالب پر روشنی ڈالی، الوہیت وتوحید اور صمدیت کا مطلب بیان کیا، تخلیق وتولید کا فرق واضح کیا، غالباً تین روز میں تفسیر قل ہو اللہ مکمل ہوئی۔ سامعین اس سورت کی جسے وہ اپنی پنجوقتہ نمازوں میں پڑھا کرتے تھے تفسیر وتشریح سے بہت متاثر ومحظوظ ہوئے اور ممبران وصدرِ منتظمہ کمیٹی مسجد نواب خسرو مرزا صاحب نے کہا کہ اب آپ ہی اس مسجد میں ترجمہ وتفسیر کا درس دیا کریں، مولانا نے ہر چند منع کیا، لیکن دوسری طرف سے پیہم اصرار کی وجہ سے مولانا نے تفسیر کا درس شروع کیا۔

تصوف پر گہری نظر اور وسعتِ معلومات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہوتا ہے:

چند سال قبل میں اور مولوی ڈاکٹر ماجد علی خاں لیکچرر جامعہ کالج مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، ڈاکٹر ماجد علی خاں باضابطہ سلسلۂ تصوف میں داخل ہیں، نیز رموزِ تصوف سے واقف، گفتگو کا رُخ تصوف اور وحدت الوجود کا باضابطہ نظریہ پیش کرنے والے حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور ان کی ادق کتابوں کی طرف مڑ گیا۔ مولانا نے اس وقت طویل تقریر نہیں کی، بلکہ چند سوالات کیے اور مختصر طور پر چند رموزِ تصوف بیان کیے

جس پر ماجد علی خاں صاحب کہنے لگے کہ آج معلوم ہوا کہ ہم بے پڑھے لکھے ہیں۔ ہم نے اس موضوع پر کچھ نہیں پڑھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ذکر تھا مجالسِ عُرس و بزمِ مقالات حضرت نظام الدین اولیاء کا، مولانا فرمانے لگے کہ یہ لکھنا اور بیان کرنا بہت آسان ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کی کب اور کہاں ولادت ہوئی، لباس کیسا پہنتے تھے، کھانا کیسا تناول فرماتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضرت کی زندگی کا اصل مقصد، جس کی تبلیغ میں حضرت نے اپنی عمرِ عزیز صرف کر دی، یعنی حقیقتِ تصوف، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اور اصل چیز یہی ہے، بعض اوقات تصوف خصوصاً نظریۂ وحدت الوجود پر نجی صحبتوں میں نہایت بصیرت افروز تقریر فرماتے، رموز و اشاراتِ تصوف جا بجا ان کی تفسیر بیان السبحان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے منتسبین میں بہت کم حضرات کو یہ معلوم ہو گا کہ مولانا جلالی نظریۂ وحدت الوجود کے قائل و حامی تھے۔

مولانا جلالی مرحوم ذہانت کے اعتبار سے عبقری (جینیس) تھے۔ ان کی ذہانت کے بہت سے واقعات ہیں جو ان کے شاگردوں اور احباب کو یاد ہوں گے، میں چند مختصر واقعات اس سلسلے میں بیان کروں گا۔

مولانا جلالی مرحوم کے فارسی زبان و ادب کے آخری امتحان منشی فاضل جو اس زمانے میں نہایت مشکل اور اہم امتحان ہوتا تھا، کے پاس کرنے کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ مولانا نے ارادہ کیا منشی فاضل کے امتحان دینے کا جبکہ صرف ۲۵ روز بعد امتحان ہونے والا تھا، علی نقی صاحب شادماں جو فارسی امتحانات کے مدرسہ عالیہ میں انچارج تھے، ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ نصاب کی کتابیں آپ کے پاس ہیں نہیں، دن بہت تھوڑے باقی ہیں، آپ کیسے امتحان دیں گے؟ مولانا نے اپنے برادر حقیقی مولوی سید عبدالسلام میاں صاحب سے کہا کہ امتحان ضرور دوں گا۔ رامپور کے ایک اور صاحب جن کے

والد سے مولانا کے والدِ بزرگوار کے تعلقات تھے منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہو رہے تھے، ان کے والد ہی کے ذریعہ طے ہوا کہ ان کی کتابیں مستعار لی جائیں، چنانچہ ایک کتاب صبح ساڑھے نو بجے لی جاتی تھی اور پانچ بجے شام واپس کر دی جاتی تھی، یعنی ایک کتاب کا مطالعہ صرف ایک روز کیا، بس یہی تیاری تھی۔ امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔

وزیر احمد صاحب ہیڈ ماسٹر مرتضیٰ اسکول رامپور نے فارسی میں ایم اے کا امتحان مولانا سے پڑھ کر دیا تھا، موصوف فرماتے تھے کہ میں نے ایسا انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، فارسی کی جو کتاب اُن کے سامنے رکھ دیتا ہوں، بغیر مطالعے کے اپنی ذہانت سے اُس کا مطلب سمجھا دیتے ہیں، گھر آکر جب قاآنی اور خاقانی کی شروح دیکھتا ہوں، تو سب کچھ وہی ہوتا ہے جو مولانا سمجھا دیتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ رامپور تشریف لائے، مدرسہ عالیہ رامپور میں آپ کے خطاب سے قبل چند توصیفی کلمات حضرت شیخ الاسلام کی شان میں مولانا جلالی نے کہے، مولانا مدنی نے اپنی تقریر میں اظہار ناراضگی فرمایا کہ لوگ میرے متعلق تعریفی کلمات کہنے میں مبالغہ کرتے ہیں جو نامناسب ہے، تقریر ختم ہونے کے بعد مولانا جلالی شکریہ ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، اور برجستہ اُن کلمات توصیفیہ کی بہت عمدہ فلسفیانہ انداز میں تشریح کی، اور ایک ایک تعریفی جملے کا جو انھوں نے مولانا مدنی کے متعلق کہے تھے ترجمہ کیا اور کہا کہ میں نے مبالغہ نہیں کیا، کیا حضرت مدنی اِن صفات سے متصف نہیں ہیں، حضرت مدنی مسکرانے لگے۔

شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ مولانا عبد الدائم صاحب خطابت و تحریر دونوں میدانوں کے شہسوار تھے، لیکن اُن کی خطابت سے عوام کم اور خواص زیادہ مستفید ہوتے تھے، مولانا پیشہ ور واعظ نہیں تھے، اس لئے اُن کی تقاریر میں اُتار چڑھاؤ

نہیں تھا، اور نہ ان کی تقریریں لطائف قصص ہوتے تھے، لیکن موصوف کی تقریر بے جھجک سادہ اور ایسی مربوط ہوتی تھی کہ اگر لکھ لی جائے تو ایک مبسوط مقالہ تیار ہو جائے، بلکہ تقریر مقالہ ہی ہوتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ غالب اکیڈمی میں ایک ماہر تعلیم پروفیسر کا اردو میں ایک مقالہ سنا، کچھ لوگوں کا اور خود میرا یہ خیال تھا کہ پروفیسر موصوف تقریر کر رہے ہیں، لیکن معاً یہ خیال و تعجب ہوا کہ ایسی مربوط تقریر مولانا جلالی کے علاوہ کون کر رہا ہے، فوراً ابعد ہی تعجب رفع ہوگیا، پروفیسر موصوف مقالہ پڑھ رہے تھے تقریر نہیں کر رہے تھے۔ مولانا جلالی کی گفتگو بھی مربوط اور منطقی اسلوب پر ہوتی تھی۔

مولانا کا دوسرا اہم میدان تصنیف و تالیف ہے، جس کے باعث وہ وفات کے بعد بھی زندہ رہیں گے اور طالبانِ علم و جویانِ حق ان کی تالیفات سے مستفید ہوتے رہیں گے، اور یہ عبادت مولانا مرحوم کی آخرت کے لئے باعثِ اجر ہوگی۔ انشاء اللہ

اپنے ابتدائی دور میں تقریباً پچاس ساٹھ سال قبل مولانا جلالی مرحوم نے ایک ماہنامہ "معلم عربی" کے نام سے شائع کیا، جس میں ایک جانب عربی ہوتی تھی اور دوسری طرف اردو۔

دوسرا مشہور مجلہ جس کا اجراء پہلے "اتحاد" اور پھر "اتحاد اسلامی" کے نام سے کیا گیا، اس رسالے کی مجلسِ ادارت میں مشہور شاعر آزیزدانی اور محشر عنایتی شامل تھے، رئیس التحریر مولانا سید عبدالدائم صاحب تھے، اس رسالے کے مضامین سے مولانا کی وسعتِ معلومات اور ایک لائق صحافی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غالباً اسی زمانے میں مولانا مرحوم نے ایک کتاب "شعرالعرب" علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "شعرالعجم" کے طرز پر تالیف کرنا شروع کی تھی، جاہلی شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ پہلی جلد کی شکل بطور مسودہ مولانا کے برادرِ خورد جناب مولانا سید عبدالسلام میاں

کے پاس موجود ہے، اگر یہ کتاب طبع ہو جاتی تو طلباء و اساتذۂ ادب عربی کے لئے کافی ادبی و علمی سرمایہ مہیا ہو جاتا۔

اور اسی دور میں مولانا نے استاذ عبدالحسین عراقی کی تالیف "الزھور فی رامپور" کے لئے عربی میں کافی مواد فراہم کیا، یہ کتاب رام پور اور نوابان کی بزبان عربی تاریخ ہے۔

مولانا سید عبدالدائم صاحب کثیر الترجمہ اور سریع الترجمہ تھے۔ تقریباً پچاس سال قبل صحاح ستہ میں سے پانچ کتابوں، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ تجرید بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ سب تراجم زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ کتب مذکورہ کا سادہ اور شستہ زبان میں ترجمہ کیا ہے، جو اس قدر عمدہ اور جامع ہے کہ ترجمہ پڑھنے کے بعد شرح کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حدیث شریف کا معیار، نیز احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ان تراجم سے عوام و خواص دونوں مستفید ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ سنا گیا ہے کہ ان میں سے بعض تراجم حال میں بعض چور مصنفین نے اپنے نام سے شائع کیے ہیں۔

امام الاولیا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی کتاب "غنیۃ الطالبین" کا ترجمہ بھی انھیں کا کیا ہوا ہے جو پاکستان میں عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔

ایک چھوٹا سا رسالہ "مبادیِ منطق و فلسفہ" طلبار کے لئے تحریر کیا ہے، جو دس روز کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ رسالہ داخلِ نصاب جامعہ طبیہ و طبیہ کالج ہے۔

تفاسیر کے ذکر سے قبل ایک عربی کتاب "الغزو الفکری" کے ترجمے کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ کتاب موجودہ دور کے ایک اخوانی عالم کی ہے، جس میں جدید اصطلاحات بھی استعمال کی گئی ہیں، یہ ترجمہ جماعت اسلامی کے کسی معتمد کے پاس محفوظ ہے، طبع نہیں ہوا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہیں ہوگا کہ مولانا کو عربی بولنے پر گو زیادہ قدرت نہیں تھی، لیکن سمجھنے، پڑھانے اور ترجمہ کرنے پر چاہے جدید عربی ہو یا قدیم قدرتِ تامہ رکھتے تھے، لغت وادبِ عربی کے ماہر تھے۔

اُن کی ایک اور اہم کتاب "لغات القرآن" ہے، غین سے یا رتک، (الف سے غین تک مولانا عبدالرشید نعمانی کی تالیف ہے) یہ ایک علمی کتاب ہے جس میں قرآنِ عظیم میں مستعمل کلمات کے معانی ومطالب نہایت تحقیق ومحنت سے بیان کیے گئے ہیں، جیساکہ کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہے، طابع وناشر ندوۃ المصنفین دہلی ہے، اس تالیف سے اہلِ علم، طلاب ومدرسین مدارس عربیہ استفادہ کرتے ہیں۔ مجھ سے اسلامیات وعربی کے ایک فاضل استاذ فرماتے تھے کہ ترجمۂ احادیث تو عوام کے لئے ہے، لیکن لغات القرآن سے ہم لوگ، یعنی اساتذہ اور مدرسین اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ تفسیرِ مظہری کا ترجمہ بھی مولانا مرحوم کا مشہور ومعروف کارنامہ ہے۔ قرآنِ کریم کی ہندستان میں لکھی جانے والی تفاسیر میں، عربی زبان میں یہ عظیم ترین تفسیر ہے۔ یہ قول بروایت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، محدثِ اعظم علامہ سید انورشاہ کشمیریؒ کا ہے۔

اس تفسیر کے مؤلف ہیں علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی شاگردِ رشید امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور خلیفہ حضرت میاں جان جاناںؒ۔ اس کا تشریحی ترجمہ ضروری اضافات کے ساتھ بزبانِ اردو، مولانا سید عبدالدائم صاحب جلالی نے کیا ہے، جو گیارہ ضخیم جلدوں میں ہے، مولانا نے یہ ترجمہ ساٹھ سال کی عمر کے بعد شروع کیا تھا، گویا یہ آپ کے آخری دور کی یادگار ہے۔ ترجمہ بہت عمدہ اور صاف وسادہ ہے کہ ہر ایک پڑھنے والا سمجھ لے اور مطمئن ہو جائے، آسان زبان میں ہے، جو مولانا کی زبان اور تحریر نہیں معلوم ہوتی اور ضروری اضافات بشکل نوٹس کا انداز تحریر نہایت مشکل اور

فلسفیانہ ہے، جو مولانا کا طرز نگارش ہے، تعجب ہے کہ ایک ہی کتاب میں تحریر کے دو اسلوب ہیں، جو مولانا کے ماہر ترجمہ ہونے پر دال ہیں، غالباً ترجمے میں مؤلف کے اسلوب وطرز کی اتباع وپابندی کی ہے، اور اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ہر شخص کتاب کا مفہوم سمجھ لے، اور ضروری اضافات میں اپنی جولانیِ طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔

چونکہ مولانا جلالی خود ایک لائق مفسر تھے اس لئے اضافات میں کہیں کہیں مؤلف سے نہایت ادب کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ کتابت و طباعت اور کاغذ کے اعتبار سے بہت عمدہ اور لائق تحسین ہے، جو حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہ کے علم وفضل، حسنِ ذوق اور آپ کے ادارے ندوۃ المصنفین کے سلیقۂ اشاعتِ کتب کا مظہر ہے، مفتی صاحب اس لئے بھی قابلِ مبارکباد ہیں کہ آپ نے ترجمے کے لئے سید عبدالدائم صاحب جیسے لائق مفسر اور ماہر مترجم کا انتخاب کیا۔

آخر میں مولانا جلالی کی اہم اور مایۂ ناز تالیف کا جس پر موصوف کو بھی ناز تھا۔ تفسیرِ قرآنِ عظیم جو "بیان السبحان" کے نام سے موسوم ہے، کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری ہے یہ تفسیر وسیم بکڈپو، فائن آرٹ پریس دیوبند سے ۳۰ پاروں میں شائع ہوئی ہے۔ کتابت وطباعت کے اعتبار سے ناقص ہے، بلکہ طباعت کتابت سے زیادہ قابلِ مذمت، اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ہر پارے کے آخری صفحہ پر اشتہارات ہیں، کچھ پاروں کے آخری صفحات پر فیشن ایبل گھڑیوں، برقعوں اور زیورات کے اشتہارات بھی ہیں، اس پر مولانا مرحوم بھی اظہار افسوس کیا کرتے تھے۔

بیان السبحان موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے جو قدماء کے طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں دلائلِ نقلیہ وعقلیہ دونوں بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا نے ترتیب اس طرح رکھی ہے، پہلے ترجمہ آیاتِ قرآنی کا بین السطور ہیں، اس کے بعد تفسیر تفصیلی طور پر جس میں مفسرین کے اقوال بیان کرنے کے بعد قوی قول کو ترجیح دی گئی ہے، بعد ازاں مقصود بیان، یعنی خلاصۂ آیات

جو نہایت جامع ہوتا ہے اور آخر میں اکثر مقامات پر رموز و اشارات تصوف۔ کہیں کہیں نکات اور ضروری ہدایات کا عنوان بھی قائم کیا گیا ہے اور کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتے ہیں، لیکن قرآن وسنت و اقوال صحابہ کی روشنی میں بقدرِ امکان غور کرکے کلام الٰہی کے سربستہ راز سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ ہم کو انہی کی (یعنی صحابہ کی) پیروی کرتے ہوئے قرآن مجید کے معارف جاننا اور کلام پاک کی تفسیر سمجھنا فرضِ قطعی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے، اس کی عبارت میں روانی و شگفتگی ہے، زبان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن بھی ایک عظیم تفسیر ہے، بلکہ علماء کی رائے ہے کہ نقشِ اول مولانا آزاد کا ترجمان القرآن ہے، اور نقشِ ثانی مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اضافات کے ساتھ، لیکن باعتبارِ کثرتِ اقوال مفسرین و طریقہ متقدمین اور رموزِ تصوف، مولانا جلالی کی تفسیر منفرد ہے۔ یہ تفسیر عوام ہی کے لئے نہیں بلکہ اس سے خواص بھی جن میں طلباء و اساتذہ اور صوفیاء بھی شامل ہیں، استفادہ کرتے ہیں۔

ایک اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط

کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

تفسیر: گذشتہ آیات میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ضمنی طور پر دعائے ابراہیمی میں دخل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے صرف امت مسلمہ کے لئے دعاء کی تھی۔ اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ صراحۃً اپنی دعاء میں حضورِ گرامی کا تذکرہ

کرتے ہیں، اور اِس امر کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ کعبہ کی حفاظت اور نگہداشت امتِ مسلمہ کرے گی، لیکن امت مسلمہ کو ضرورت ایک سردار کی ہوگی، جو ہر طرح سے اس امتِ مرحومہ کی قیادت کرے گا، اور تمام سعادات و برکات اسی کے چشمۂ فیض سے وابستہ ہوں گی۔ مطلب یہ ہے کہ الٰہی امتِ مسلمہ کے لئے ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمانا، اور یہ رسول نہایت عظیم الشان عالی مرتبہ ہو، اس کے اندر وہ اوصاف و اخلاق اور نورِ معارف موجود ہوں جس سے عام و خاص، جاہل و عالم، تاریک دماغ رکھنے والے اور نورِ فطری کے حامل سب یکساں فیضیاب ہوں اور ہر شخص اُس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو۔

یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِکَ ، یعنی عام لوگوں کو تیری آیات اور مقدس کلام پڑھ کر سنائے، اُن کو شریعتِ الٰہیہ کے ظاہری احکام بتائے۔

وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ ، یعنی جو لوگ عالم ہیں، لیکن علماء میں ان کا مرتبہ امتیازی نہیں بلکہ عمومی ہے، تو ایسے علماء کو وہ کتابِ مقدس کی تعلیم دے، احکام اور ادلّہ بتائے، فروع و اصول سے واقف کرے اور دلائل توحید و نبوت سمجھائے،

وَالۡحِکۡمَۃَ ، یعنی جو لوگ علماء میں امتیازی شرف رکھتے ہیں، قوتِ اجتہاد کے مالک ہیں، علمی تبحر اور وسعتِ معارف کی وجہ سے صرف احکام و ادلّہ کا علم ان کے لئے سیر کن نہیں ہے، بلکہ اُن کو اسرارِ حقائق کی ضرورت ہے، تو ایسے لوگوں کو اسرارِ شریعت کی تعلیم دے، حقائق و معارفِ الٰہیہ بتائے، رموزِ کتاب سے واقف کرے۔

وَیُزَکِّیۡھِمۡ ، یہ مرتبہ خاصانِ خاص کا ہے، اولیائے امت ہی اس مرتبہ

سے سرفراز ہیں، ان کے نفوس قدسیہ ہو بہو کمالِ نبوت کا آئینہ ہیں، جن کے اندر نورِ نبوت چمکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نبی روشن روح رکھنے والوں کے تزکیہ کا بھی سبب ہے، اُن کے آئینۂ دل میں اپنی روحانی تعلیم کے پانی سے تمام سیاہی اور زنگ دور کر کے اپنے فیوضِ قدس اور نورِ رسالت سے اُن کو منور کر دے۔

مقصودِ بیان: رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی ذات گرامی اور تمام امت مسلمہ، حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ ہے۔

امت اسلامیہ میں چار طبقات ہیں، عام، خاص، خاص الخاص، اخص الخاص۔ عام کی ہدایت کے لئے صرف معجزات اور ظاہری آیاتِ قرآنیہ اور فرامینِ نبویہ مخصوص ہیں، خاص کی ہدایت کے لئے احکام، ادلّہ، فروع و اصول، دلائلِ توحید و براہینِ رسالت کا علم ضروری ہے۔ خاص الخاص کے افادے کے لئے اسرارِ شریعت، حقائق و معارف اور رموز کی تعلیم ضروری ہے۔

اخص الخاص میں تخلیۂ رذائل اور تجلیہ بالفضائل کا مادہ تو موجود ہی ہوتا ہے، اُن کی روحیں سعید اور دل مادۂ ہدایت سے لبریز ہوتے ہیں، لیکن تخلیہ کے بعد ان کے قلوب کی صفائی اور تجلیہ و تزکیہ کی بھی احتیاج ہے، اور یہ سب کام جس حسن و خوبی سے حضورؐ اقدس نے انجام دیے وہ عدیم النظیر ہیں۔ حضورِ والا اشرف المخلوقات، اشرف الانبیاء اور خاتم النبیین ہوئے۔ سچ ہے:

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ، آیت میں ایک لطیف تلمیح اس طرف بھی ہے کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ہر مرتبے کو طے کر کے اوپر والے

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

۱-	مقام اشاعت	اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
۲-	وقفۂ اشاعت	ماہانہ
۳-	طابع کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	قومیت	ہندوستانی
۴-	ناشر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	سکونت	۳۶ ام اردو بازار دہلی
۵-	ایڈیٹر کا نام	مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے
	قومیت	ہندوستانی
	سکونت	نزد بال برادری سول لائن علی گڈھ (یوپی)
۶-	ملکیت	ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہٰذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع وناشر

عمید الرحمٰن عثمانی

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کی یہ نیک کوشش نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ پاکستان کی تاریخ ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا "رسالہ صاحبیہ" کے اصل فارسی متن اور اردو ترجمہ کے شائع ہونے پر میں اپنے محترم اور محقق دوست جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اجتہاد کا تاریخی پس منظر

تالیف : مولانا محمد تقی امینی

اجتہاد کا مسئلہ تاریخ کے ہر دور میں نازک سمجھا گیا اور ہر دور میں اس کی ضرورت و اہمیت محسوس کی گئی ہے لیکن اس مسئلہ پر کوئی جامع اور محققانہ کتاب اردو میں اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ مولانا امینی جن کا اصل میدان فقہ و اجتہاد ہے اور عرصہ سے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ادھر توجہ کی اور یہ کتاب مرتب کر کے اہل علم پر احسان عظیم کیا۔ کتاب کے مباحث میں اس قدر جامعیت و تنوع ہے کہ علماء اور طلباء دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ اصول فقہ کی جس قدر اصطلاحات ہیں ان کو نہایت سلیس و دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ حضرات اساتذہ درس کے وقت اور طلباء مطالعہ کے وقت ضرور اپنے پاس رکھیں۔

قیمت ۱۵ روپے

ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

کے اردو ترجمے کا فارسی ترجمہ جس شکل میں آیا اسے ہم ترجمے کا ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ آج جب میں اپنے فارسی ترجمے کو رسالہ صاحبیہ کے اصل فارسی متن سے ملاکر دیکھتا ہوں تو ظاہر ہے کہ دونوں کا اسلوب بیان مختلف دکھائی دیتا ہے، اگرچہ مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاش کہ یہ نسخہ مجھے پہلے دستیاب ہوجاتا تو یہ اصل نسخے کا چربہ تیار نہ کرنا پڑتا۔

ترجمہ پروفیسر ابراہیم ڈار

اس اعتبار سے پہلا ترجمہ تو پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کا ہے جو فارسی سے اردو میں شائع ہوا، لیکن میں اسے مکمل ترجمے کا نام نہیں دوں گا کیونکہ بعض جگہ جناب پروفیسر موصوف نے متن کا کافی حصہ چھوڑ بھی دیا ہے اور بعض جگہ تلخیص سے کام لیا ہے، البتہ زبان صاف اور با محاورہ، رواں دواں استعمال کی ہے، فن ترجمہ کے اعتبار سے ہم اسے ایک رواں دواں ترجمہ کہہ سکتے ہیں، لیکن ایسی صورت میں ایسے ترجمے سے رسالہ صاحبیہ کی تاریخی اہمیت کو ذرا دھچکا لگتا ہے۔

ترجمہ در ترجمہ ڈاکٹر آغا ثمین

دوسرا اردو ترجمے سے فارسی ترجمہ خود میرا اپنا ہے، کیونکہ اس ترجمے کی بنیاد اصل فارسی خطی نسخہ پر نہیں بلکہ یہ جناب پروفیسر محمد ابراہیم صاحب کے اردو ترجمے سے فارسی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ اصل نسخے کے اسلوب بیان سے ذرا ہٹ کر ہے اسے بھی ہم مکمل ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اسے بالواسطہ اصل نسخے کا چربہ کہہ سکتے ہیں۔

ترجمہ پروفیسر محمد اسلم

تیسرا ترجمہ جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کا ہے، جسے میں سمجھتا ہوں کہ رسالہ صاحبیہ کا مکمل ترجمہ کہنا چاہئے، اگرچہ زبان کے اعتبار سے یہ ایک لفظی ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا گیا ہے، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ بعینہٖ قائم و دائم ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ

مطبوعہ رسالہ صاحبیہ زیر بحث مطبوعہ "رسالہ صاحبیہ" جسے جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب نے کتابچے کی شکل میں پہلی بار شائع کیا، دو حصوں پر مبنی ہے پہلا صفحہ ۶۹ اردو کے مختصر تعارفی دیباچے سے شروع ہوتا ہے جس میں پروفیسر محمد اسلم صاحب نے "رسالہ صاحبیہ" کی تصنیف سے قارئین کو متعارف کروایا ہے۔ صفحہ ۷۱-۷۰ پر "ہوالفرد" کے عنوان سے "رسالہ صاحبیہ" کے اصلی خطی نسخے کا اردو ترجمہ ہے۔ صفحہ ۷۱ سے لے کر صفحہ ۱۰۷ تک "رسالہ صاحبیہ" کے فارسی متن کا اردو ترجمہ ہے۔

دوسرا حصہ "رسالہ صاحبیہ" کے اصل فارسی خطی نسخے کا متن بعینہٖ فارسی میں صفحہ ۷۸ سے لے کر صفحہ ۱۱۰ تک مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر پروفیسر موصوف نے انگریزی میں "رسالہ صاحبیہ" کا تعارف INTIDUETVY کے عنوان سے کیا ہے۔ اس طرح اصل فارسی خطی نسخے کے کل صفحات کی تعداد ۳۲ بنتی ہے۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اسے "ندوۃ المصنفین" سمن آباد، لاہور سے شائع کیا ہے۔

تراجم رسالہ صاحبیہ "رسالہ صاحبیہ" کا سب سے پہلے اردو ترجمہ آیا راؤ بھولاناتھ لائبریری احمد آباد کے محقق پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے با محاورہ ترجمہ کیا بلکہ یوں کہیئے کہ بعض جگہ اردو میں اُس کی تلخیص بھی ہے جو اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۳۷ء کے اگست کے شمارے میں ایک اردو مقالے کی صورت میں شائع ہوا جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے کہ پاکستان میں ۱۹۶۸ء تک "رسالہ صاحبیہ" کا کوئی اصل خطی یا مطبوعہ نسخہ موجود نہ تھا، جس کی وجہ سے مجھے اپنے پی ایچ ڈی کے مذکورہ مقالہ بعنوان "تاریخ شعر فارسی درلاہور" میں ملا شاہ لاہوری کے احوال واشعار لکھنے کے سلسلے میں، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے اسی اردو ترجمہ پر اکتفا کرنا پڑا، کیونکہ میرا مقالہ فارسی زبان میں تھا اس لئے مجھے اس کے اردو ترجمے اسے فارسی ترجمہ کرنا پڑا۔ لہذا اس اعتبار سے اصل فارسی کے خطی نسخے رسالہ صاحبیہ